ڈاکٹر محمد ساجد خان

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

محمد فیصل

سکالر ایم فل اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

سیّد ہدایت علی صبوحی: شخص و شاعر

Dr Muhammed Sajid Khan

Assistant Professor, Urdu Deptt, BZ University ,Multan

Muhammed Faisal

Scholor M Phil Urdu Deptt, BZ University ,Multan

Syed Hidayat Ali Saboohi: A Person and a Poet

Notwithstanding that Syed Hidayat Ali Subohi has been a major Multani poet, he could not rose to prominence. This article is the first humble attempt to take into accounts his life and works, a preamble to his collected works compiled for the first time. Among the twentieth century Multani poets, Subohi enjoys a critical accolade in Urdu ghazal and Naat. His introvert nature is somehow to be blamed for his unpopularity. Besides being a physician, he has been an active participant for Pakistan Movement. Though he has been discussed in several history reviews, his voluminous contribution to Urdu literature deserves more. The paper looks forward to enrich the Multani poetic tradition by bringing Subohi's works from the unknown alleys of past to limelight.

ملتان کے گنجینۂ سخن کے ایک گوہرِ گم گشتہ سید ہدایت علی صبوحی دہلوی ۱۶/اپریل ۱۹۱۶ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ ان کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے اختلاف موجود ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنی کتاب میں ہدایت علی صبوحی کی تاریخ پیدائش ۱۹۰۷ء لکھی ہے جو کہ غلط ہے کیونکہ صبوحی کی تاریخ پیدائش ان کی منشی فاضل کی سند اور گھر والوں کے مطابق ۱۶/اپریل ۱۹۱۶ء درج ہے☆۱ لیکن میٹرک کی سند پر اپریل کی بجائے فروری لکھا ہوا ہے☆۲۔ اس لیے میں نے ۱۶/اپریل ۱۹۱۶ء ہی لکھی ہے کیوں کہ دونوں حوالوں سے اُن کی تاریخ پیدائش اپریل ہی بنتی ہے۔ ممکن ہے کہ میٹرک کی سند پر غلطی سے اپریل کی بجائے فروری لکھا گیا ہو۔ ہدایت علی صبوحی اپنا تخلص صبوحی استعمال کرتے ہیں اور آپ

صبوحؔی دہلوی کے نام سے مشہور تھے آپ کے والد کا نام سید یوسف علی شاہ تھا سید یوسف علی مدرسہ اسلامیہ میرٹھ کے مہتمم اعلیٰ تھے جو قرآن مجید کے عالم، محدث اور فقہ کے اُستاد تھے۔ سیّد ہدایت علی صبوحؔی نے ۱۹۳۰ء میں عربیک، پرشین ایگزامینیشن میرٹھ (یو۔پی) سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء میں فارسی آنرز کی سند بھی پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی ☆۳۔ ۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو مدرسہ سہارنپور سے عربی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ یکم دسمبر ۱۹۳۷ء میں ڈپلومہ منبع الطلب لکھنؤ کالج سے حاصل کیا ☆۴۔ ۱۹۳۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان انگلش کے ساتھ پاس کیا پھر ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ہی اُردو آنرز کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا ☆۵۔ ۱۹۴۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ہی انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی انگلش کے ساتھ پاس کیا ☆۶۔

۱۹۳۰ء میں منشی فاضل کرنے کے بعد وہاں عربی اور فارسی پڑھاتے رہے۔ Mrs. Eruin L. Pedeesen Saharnpur (UP) کا خط ہدایت علی کے نام ہے۔ یہ انگریز خاتون بھی ہدایت علی صبوحی کی شاگرد تھی اور اُس نے اپنے اُستاد کے بارے میں لکھا ہے کہ ہدایت علی عربی اور فارسی بہت اچھی پڑھاتے تھے ☆۷۔ ۱۹۳۲ء میں مدرسہ سہارنپور میں بھی چھ ماہ تک پڑھاتے رہے۔ دسمبر ۱۹۳۶ء میں آپ نے منبع الطلب کالج لکھنؤ سے فاضل طب و جراحت العربیہ کی ڈگری حاصل کی اور بعد ازاں مدرسہ مخزن العلوم العربیہ سہارن پور میں بطور طبیب اور معلم فرائض انجام دیتے رہے۔

ہومیو پیتھک کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد چاندنی چوک اور دریا گنج دہلی میں طبیب حاذق کے طور پر کام کرتے رہے۔ ہومیو پیتھک میں ہدایت علی صبوحی کے اُستاد ڈاکٹر پیارے لال تھے جنہیں ہومیو پیتھک کا ہندوستان میں بانی تصور کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ چھ ماہ تک ہومیو پیتھک کی تعلیم بھی دیتے رہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر پیارے لال کا ایک خط موجود ہے جو انہوں نے ۱۹۳۷ء میں لکھا۔ مکمل خط پڑھا جانا ممکن نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ ہدایت علی صبوحی لکھنؤ مطب میں پڑھاتے رہے ہیں۔ سید آنس معین بلے مرحوم نے ہدایت علی صبوحی کی وفات کے بعد شائع ہونے والے مضمون میں لکھا ہے کہ آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی [۲] لیکن جو ڈگریاں مجھے ان کے گھر سے ملی ہیں ان میں ان کی بی۔اے کی ڈگری نہیں ہے بہر حال آنس معین کی بات بھی مستند تسلیم کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ آپ کے دوست بھی تھے اور اخبار کا حوالہ بھی معتبر ہے۔ تمام تعلیمی اسناد کے بعد آپ کی علمی حیثیت مسلّم ہے کہ آپ ایک علمی شخصیت ہیں۔

ہدایت علی صبوحی کا معتبر حوالہ سیاست بھی ہے۔ تحریک پاکستان میں دامے، درمے اور سخے مدد کرتے رہے ان کی ڈگریوں میں ایسے کاغذات ملے ہیں جن میں مسلم لیگ کو فنڈ دینے کی رسیدیں بھی ہیں جن میں بعض پر قائداعظم کے دستخط بھی موجود ہیں۔ یہ بات سکندر عقیل رحمانی نے لکھی ہے کہ آپ مسلم لیگ کے صوبہ دہلی کے جنرل سیکرٹری رہے [۳] اور دیگر دوست احباب بھی یہی بتاتے ہیں۔

ہدایت علی صبوحی صوبہ دہلی میں مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری رہے اور آپ تحریک پاکستان کے سرگرم کارکنان میں سے تھے۔ قائداعظم کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے جنہوں نے تحریک پاکستان میں پاکستان حاصل کرنے کے لیے انتھک کوششیں کی ہیں ان کوششوں کے نتیجے میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا لیکن قائداعظم کے حکم پر صبوحؔی دہلوی دہلی ہی میں رہے اور ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی مدد کرتے رہے اور انڈین گورنمنٹ کی طرف سے جسٹس آف پیس مقرر کیے گئے۔ ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ خاص طور پر سکھ مسلمانوں کا بے دریغ قتل کر رہے تھے ایسے میں آپ نے ایک سکھ کا روپ دھار لیا اور سکھوں میں گھس گئے اور ان سے مسلمانوں کو چھڑواتے کہ یہ مسلمان میرے دشمن ہیں اس لیے انہیں میں قتل کروں گا لیکن بعد میں انہیں لال قلعہ دہلی پہنچا دیتے تا کہ بحفاظت انہیں پاکستان پہنچایا جا سکے۔ اس طرح آپ

نے بہت سے مسلمانوں کی جانیں بچائیں، لیکن آخر کار سکھوں کو پتا چل گیا۔ انتقاماً انہوں نے آپ کی لائبریری اور گھر کو آگ لگا دی اور انڈین گورنمنٹ نے آپ کے نام بلیک وارنٹ جاری کر دیے۔ اِن حالات میں آپ کو وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ آپ بڑی مشکلوں سے جان بچا کر کراچی پہنچے۔ آپ کسی وزیر سے ذاتی مخالفت کی وجہ سے کچھ عرصہ حیدر آباد جیل میں بھی رہے۔ رہا ہونے کے بعد ملتان چلے آئے اور پھر تمام زندگی ملتان میں گزار دی۔ سید ہدایت علی صبوحی کو مختلف عہدوں کی پیشکش بھی ہوئیں لیکن آپ نے تمام پیشکشیں ٹھکرا دیں اور آپ نے پاکستان برماشیل کمپنی جو کہ ملتان ڈویژن کی پہلی تیل کی ایجنسی تھی حاصل کرنے کو ترجیح دی یوں آپ ۱۸ر جون ۱۹۵۷ء میں چیمبر آف کامرس ملتان کے ممبر بنے ☆۸۔ چیمبر آف کامرس کے اس وقت پانچ ارکان تھے اور آپ اس کے بانی ارکان میں سے ایک تھے۔[۴] برماشیل کمپنی کی ڈسٹری بیوشن کا کاروبار زیادہ فروغ نہ پا سکا اور اِس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس زمانے میں آپ کی بڑی بیگم صاحبہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گئیں اور ایک سال سے زائد عرصے تک جناح ہسپتال کراچی میں زیرِ علاج رہیں، وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ صبوحی صاحب بیگم صاحبہ کی تیمارداری کے حوالے سے اس تمام عرصے میں اُن کے ساتھ رہے۔ ملتان میں اُن کے کاروبار کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا اس لیے واپس آ کر وہ اس کاروبار سے الگ ہو گئے۔

۶۷-۱۹۶۸ء میں آپ نے ''بورڈ آف یونانی اینڈ ہومیو پیتھک سسٹم آف میڈیسن'' میں رجسٹریشن کروائی اور ہومیو پیتھک کا مطب کھول لیا ☆۹۔ وہاں بھی آپ کی فراخ دلی نے کام دکھایا اور مستحق مریضوں کا مفت علاج کرتے رہے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں جریدے ''طوفان'' کے مدیر بھی رہے۔ ۲۳ر مئی ۱۹۶۳ء کا ایک شمارہ ملا ہے جس میں ایک اداریہ لکھا ہوا ہے:

> ''ہم نے طوفان میں ان علمائے اہلِ سنت کی سوانح حیات کا سلسلہ شروع کیا ہے جو بحمد للہ حیات ہیں اگر علمائے کرام نے ہم سے تعاون کیا تو آہستہ آہستہ شرکائے تذکرہ کے متعلق ایک اہم اور مستند کتاب مرتب ہو جائے گی۔ اس لیے ہم حضراتِ علمائے اہلِ سنت سے جن کا بریلی کے مکتبۂ فکر سے تعلق ہے بعد ادب گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس اہم ملی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور پہلی فرصت میں اپنے حالات زندگی تعلیم و تعلّم روحانی نسبت موجودہ مشاغل اور تاریخ پیدائش وغیرہ سے ہمیں قریبی فرصت میں مطلع کریں تا کہ ہم اُسے بطور خود ترتیب دے کر شائع کرتے رہیں۔'' (صبوحی)

اس کے علاوہ سکندر عقیل رحمانی نے ''آفتاب'' ۱۷ر اکتوبر ۱۹۸۱ء اور عزیر حاصل پوری (جو کہ ان کے دوست تھے) نے لکھا ہے کہ صبوحی صاحب ''طوفان'' کے مدیر رہے ہیں چونکہ یہ رسالہ زیادہ مشہور نہیں تھا اس لیے زیادہ لوگ اسے نہیں جانتے تھے۔ ایک اختلاف یہاں بھی موجود ہے کہ حنیف چوہدری نے اپنی کتاب ''ملتان کے صحافتی دفینے'' ص ۶۷ میں لکھا ہے کہ ہفت روزہ ''طوفان'' ۱۹۲۷ء میں ملتان سے شروع ہوا اور ۱۹۲۴ء میں بند ہو گیا۔ یہ تو ممکن نہیں ہے اگر کمپوزنگ کی بھی غلطی مان لی جائے کہ ۲ کا ہندسہ پیچھے کی بجائے آگے لگ گیا تو بھی یہ ۱۹۴۲ء بنتا ہے۔ ۱۹۶۳ء کے شمارے کی ایک کاپی مجھے ملی ہے اور صبوحی کے دوستوں سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ شمارہ دوبارہ جاری ہوا ہے اور صبوحی دہلوی اس کے مدیر رہے ہیں۔ اس شمارے میں آپ کی ایک نظم ''کہتا ہوں خدا اُن کو محبت کی زبان میں'' شائع ہوئی ہے۔ بحیثیت شاعر آپ کے احباب میں حبیب جالب، عاصی کرنالی، تابش صمدانی، ظفر تاباں، جعفری، وارثی، ایاز صدیقی، اقبال ارشد، حسین سحر، اصغر علی شاہ، اسد اریب،

ڈاکٹر محمد امین وغیرہ شامل ہیں۔

سید ہدایت علی صبوحی دہلوی کی دو شادیاں تھیں۔ پہلی بیوی کا نام قیصرہ بیگم تھا جو جامعہ مسجد دہلی کے امام کی بھتیجی تھیں اور ان سے تین بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بیٹوں کے نام ہیں سید انور علی جو کہ چارٹڈ اکاؤنٹینٹ ہیں، سید لیاقت علی بینکر ہیں اور سید واجد علی بھی بینکر ہیں۔ بیٹیاں بالترتیب ہیں خدیجہ بیگم، نسیم بانو، مینا بانو، خالدہ بیگم۔ ہدایت علی صبوحی کی پہلی بیوی جو کینسر کے سبب فوت ہوئیں کراچی میں مدفون ہے۔

دوسری شادی شمیم بانو سے ہوئی۔ شمیم بانو کے والد سول انجینئر تھے جن کا نام وحید علی تھا۔ دوسری بیوی سے دو بیٹے ہیں ڈاکٹر سید محمد علی نشتر میڈیکل ہسپتال میں گائنا کالوجسٹ ہیں دوسرے بیٹے کا نام سید فیض علی ہے جو کہ سعودی عرب میں فزکس کے پروفیسر ہیں۔ آپ کی اولادوں میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ملتان میں، ایک بیٹا لاہور، ایک امریکہ اور باقی اولاد کراچی میں رہتی ہے۔

آپ کی شاعری میں شخصیت کسی حد تک سامنے تو آتی ہے لیکن بہت سی چیزیں مبہم بھی رہتی ہیں جو گھر والے جانتے ہیں یا دوست احباب اس حوالے سے آپ کے دوستوں سے انٹرویو کیے ان انٹرویوز سے جو شخصیت سامنے آتی ہے وہ کچھ یوں ہے۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی بتاتے ہیں:

> ''ہجرت کے بعد جن ادباء اور شعراء نے مدینۃ الاولیاء ملتان کا رُخ کیا اُن میں ایک اہم شخصیت صبوحی دہلوی بھی تھے جو یہاں قیام کے بعد جلد ہم سے رخصت ہو گئے، لیکن اپنی محبت بھری یادیں چھوڑ گئے۔ صبوحی دہلوی سادہ لباس، سادہ مزاج، متواضع اور خوش اخلاق شخص تھے اور شاعری میں ایک ممتاز شخص کے طور پر جانے جاتے تھے۔''[۵]

ڈاکٹر شوذب کاظمی بتاتے ہیں:

> ''صبوحؔی دہلوی اپنی شخصیت کے لحاظ سے دینی اور مذہبی رجحانات کے حامل اہلِ علم تھے ان مذہبی رجحانات کے اثرات ان کی تخلیقی کاوشوں پر بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔''[۶]

ڈاکٹر محمد امین بتاتے ہیں:

> ''صبوحؔی دہلوی خوش اخلاق اور ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔''[۷]

ڈاکٹر صدیق قادری کا بیان ہے:

> ''صبوحی دہلوی ممتاز شاعر، ادیب اور دانشور تھے۔۔۔ جنھیں میں نے مختلف تقریبات میں دیکھا اور مختلف مشاعروں میں سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔[۸]

ان تمام چیزوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صبوحؔی دہلوی کی جو شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ آپ متحرک انسان تھے، ملنسار تھے، سادہ لباس تھے۔ بناوٹ کے مرض میں مبتلا نہیں تھے۔ تمام دوست احباب سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آتے تھے جس سے آپ

کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ملتا ہے جو کہ کسی انسان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔آپ بھی ان تمام خوبیوں کے مالک تھے۔ملتان کے سیاسی خانوادوں میں سے جناب ممتاز دولتانہ، جناب علمدار حسین گیلانی اور جناب دیوان عباس سے صبوحی دہلوی کے دوستانہ مراسم تھے۔

سید ہدایت علی صبوحی نے قیامِ پاکستان سے پہلے سیاسی سرگرمیوں میں بہت زیادہ حصہ لیا لیکن جب پاکستان بن گیا تو پاکستان آنے کے بعد تمام سیاسی سرگرمیاں ترک کر دیں اور کاروبار کرتے رہے پھر کاروبار بھی چھوڑ دیا اور مطب یونانی چلاتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد آپ کی زیادہ تر توجہ ادب کی طرف رہی جس میں شاعری آپ کا خاص میدان ہے۔شاعری میں آپ کی ایک منفرد حیثیت ہے۔آپ آخری عمر میں فالج کے مرض میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔آپ نے ۴ ستمبر ۱۹۸۱ء کو وفات پائی۔

شاعرانہ عظمت:

ملتان کی شعری روایت میں ہدایت علی صبوحؔی ایسے نغز گو، خوش گفتار، منفرد اور توانا لب و لہجے کے شاعر کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ہدایت علی صبوحؔی غزل کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ بیسویں صدی کی غزل کے اسالیب اور موضوعات کے اثرات اُن کی شاعری میں موجود ہیں۔ چوں کہ کسی ایک دور میں موضوعات میں بہت حد تک یکسانیت ہوتی ہے۔اس لیے کوئی بھی بڑا شاعر اِردگرد کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔شاعر معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔اس کی سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی لکھا ہے:

''غزل کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک دور میں غزل کے موضوعات تمام شعرا کے ہاں تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ ان موضوعات کی نوعیت بھی عام طور پر عمومی اور اجتماعی ہوتی ہے۔''[۹] ممکن ہے کسی کو وزیر آغا کی اس بات سے اختلاف ہو، لیکن ان کی بات کو یکسر مسترد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ حالات و واقعات میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو تمام لوگ اس سے متاثر ضرور ہوتے ہیں، لیکن اس کو بیان کرنے کی صلاحیت ہر کسی میں موجود نہیں ہوتی۔ یہ شاعر ہی ہوتا ہے جو ہر طرح کے نامساعد حالات میں بھی اُمید کا دامن تھامے رہتا ہے۔ صبوحؔی بھی انھیں شعراء میں سے ہیں۔شعر دیکھئے:

حالات اب مساعدِ قسمت نہیں نہ ہوں
موڑا ہے ہم نے وقت کا دھارا کبھی کبھی
بحرِ الم میں ایسے بھی طوفان گزر گئے
ہر موجِ غم کو سمجھا کنارا کبھی کبھی

صبوحؔی بیسویں صدی کے شاعر ہیں۔ یہ وہ صدی ہے جس میں بہت بڑی اور اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔سائنسی ترقی بھی عروج پر پہنچی۔اس کے ساتھ ساتھ انسانی شعور بھی وقت کے ساتھ تیزی سے بدلا اور جہاں انسان آسانیوں کی تلاش میں تھا وہاں بہت سے مسائل میں بھی الجھا ہے۔بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں خاص طور پر جو سیاسی حالات جو ہمارے سامنے تھے اُن میں اہم ترین ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک تھی۔ ہندوستان کے مسلمان الگ ملک حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔قیامِ پاکستان کے بعد جو قتل و غارت ہوئی اور انسانی خون کی جس طرح پامالی کی گئی اُس سے صبوحی صاحب بہت زیادہ اثر پذیر ہوئے۔ پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل جو گھمبیر تر ہوتے جا رہے تھے اُن سے ایک حساس اور دردمندانہ جذبہ حب الوطنی رکھنے والا کوئی بھی شاعر صرفِ نظر نہیں کر

سکتا تھا جبکہ صبوحی دہلوی دامے، درمے، سخنے تحریکِ پاکستان میں فعال کردار ادا کرنے کے قابلِ فخر ماضی کے حامل شخص تھے۔ اس صدی میں اجتماعی آزادی اور پھر فرد کی آزادی نے انسانی مسائل کی نئی نئی صورتیں پیدا کر دی تھیں۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی کے شروع ہی سے انسان نے اپنی ذات کے پُراسرار جزیرہ کو محلِ سیاست بنایا ہے اس کے اِردگرد جو اَتھاہ سمندر ہیں ان کی نوعیت کا پتہ چلانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے آپ کو پہلے سے بہتر اور واضح تر جاننا چاہا ہے۔ فرد اور اجتماع کے باہمی تعلق پر غور کیا ہے۔ فرد کسی حد تک اپنی آزادی ریاست کے حوالے کر دے کہ امن اور اطمینان کی نعمت بدلے میں لے سکے فکرِ انسان نے اس بات کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔''[۱۰]

ہدایت علی صبوحی کا شمار جدید غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ جدید غزل گو شعراء کے ہاں روایتی عشق کے معاملات کے علاوہ معاشرتی اور سیاسی موضوعات بھی پائے جاتے ہیں کیوں کہ جدید غزل کے شعراء نے قدیم موضوعات سے ہٹ کر سوچا اور لکھا ہے۔ سید عابد علی ہی لکھتے ہیں:

''جدید غزل گو اپنے آپ سے اپنی ذات کی پیچیدگیوں سے قدیم شاعروں کی نسبت کہیں زیادہ آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل میں انسانی اعمال کے محرکات کا تجزیہ بہت خوبی سے کیا جا سکتا ہے۔''[۱۱]

قدیم شعراء صرف حسن و عشق کی واردات ہی غزل میں بیان کرتے تھے، لیکن جدید شعراء نے غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا کر دی۔ زندگی کے تمام مسائل کو غزل کا موضوع بنایا۔ صبوحی بھی انھی جدید شعراء میں سے ہیں جو اپنے کلام میں حسن و عشق کے موضوعات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی مسائل پر بے باکی کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ معصوم رضا کے ان جملوں پر بھی صبوحی پورے اُترتے ہیں کہ بڑا ادیب وہی ہوتا ہے جو ہر دور میں اسی دور کا لگے۔ معصوم رضا لکھتے ہیں:

''ادب آئینہ ہے، زندگی اور سماج کا اور شاعری اُس آئینہ کا جوہر۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زندگی نام ہے سماج کے مرغزار میں کھلے ہوئے پھول کا رنگ برنگے پھول، لال، پیلے، نیلے بنفشے مختلف رنگوں کے پھول اور شاعری اُس پھول کی خوشبو ہے۔''[۱۲]

صبوحی دہلوی کی شاعری ادب اور زندگی کے درمیان پائے جانے والے قابلِ تقسیم رشتے کی گواہی دیتی ہے۔ اپنے آپ کو زندگی اور معاشرے سے جڑا ہوا فرد سمجھتے ہوئے وہ اپنی شاعری میں زندگی کی نیرنگیوں کا اظہار اِس قدر عمدگی اور سلیقے سے کرتے ہیں کہ شعر کا جمالیاتی حسن بھی مجروح نہیں ہوتا۔ مثلاً انھوں نے انسان کے دُکھ درد کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ خاص طور پر غریب اور مظلوم طبقے پر ظلم و ستم کی داستان یوں بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

گاؤں کے باخدا زمیندارو
گیت انسانیت کے گاتے ہو
بھیڑیے بن کے کاشت کاروں کا
خون پیتے ہو گوشت کھاتے ہیں

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

وہ جو مرتا ہے کھیت میں دن رات
دانے دانے کو خود ترستا ہے
ہاں زمیندار کی حویلی میں
فصل کٹتی ہے ہُن برستا ہے

صبوحؔی دہلوی کے ہاں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں مزدور طبقے کی بے بسی اُن کا اپنا دُکھ بن جاتا ہے۔ایسی ہی کسک آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔کہ وہ ہمیشہ اس بات پر کڑھتے نظر آتے ہیں کہ کیا آزادی ہم نے اس لیے حاصل کی تھی کہ اس ملک میں چند لوگ اقتدار میں آ کر ملک کو بیچنے پر تُل جائیں۔مثال ملاحظہ ہو:

اک بار ترے ہتّھے جو چڑھ جائے یہ ملت
تو بیچ بھی آئے اسے پھر بھی یہ تری ہے

آزادی کے حوالے سے ان کی شاعری میں تیکھا طنز موجود ہے۔لکھتے ہیں:

فٹ پاتھ پہ آلام کی روداد ہیں ہم لوگ
اے دوست یہ کیا کم ہے کہ آزاد ہیں ہم لوگ
روٹی کا نہ کپڑے کا نہ رہنے کا ٹھکانہ
برباد ہیں ہم لوگ کہ آباد ہیں ہم لوگ
اے دوست یہ کیا کم ہے کہ آزاد ہیں ہم لوگ

صبوحؔی کی شاعری میں زندگی سے وابستہ تمام موضوعات شامل ہیں۔غریب اور مجبور طبقات کے دُکھ درد اور مسائل اُن کی سوچ اور تخلیقی شخصیت کا نہایت قابلِ ذکر حوالہ قرار پاتے ہیں۔حکمرانوں کی بے رُخی کا دُکھ بھی اُن کی شاعری کا اہم پہلو رہا ہے۔انہوں نے ہمیشہ انقلابی سوچ کو اپنائے رکھا لیکن جب آزادی ملی تو صبوحی صاحب نے محسوس کیا کہ مقتدر طبقے میں آزادی کے مقصد کو بھلا دیا ہے اور اپنی انفرادی زندگی کو سنوارنا شروع کر دیا ہے۔اس کے لیے چاہے اپنے ہم وطنوں کی لاشوں پر سے ہی کیوں نہ گزرنا پڑے۔انھی حالات کو دیکھ کر صبوحؔی نے ایک مقام پر یہ بھی کہا:

بیماریاں ہیں وہ بھی مفلسی ہی کو ہیں ڈستی
بھاگو یہاں سے ڈھونڈیں اب اور کوئی بستی

تاہم صبوحؔی کی شاعری، زندگی سے فرار کا راستہ نہیں دکھاتی بلکہ زندگی کے زہر کے لیے تریاق تلاش کرنے کی سعی کرتی ہے۔ ایک باہمت انسان کی طرح وہ خود بھی بڑی بہادری سے زندگی سے مقابلہ کرتا ہے اور ہمیشہ انقلاب کی باتیں کرتا ہے۔ اپنے وطن سے انھیں عشق ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ اپنے وطن کے مسائل پر کڑھتے نظر آتے ہیں۔ یہی جذبہ حبِ وطن ان کی شاعری میں بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کی تلخیوں اور معاشرتی ناہمواریوں کی داستان ان کی شاعری میں موجود ہے۔ ان کی شاعری میں انقلاب کی روح ہے جو پڑھنے والے کو سوچنے اور اپنے اردگرد کے حالات پر غور وفکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ انقلابی فکر ہمیں اقبالؔ اور فیضؔ کی یاد دلاتی ہے۔ اقبال اور فیض اپنی مثال آپ ہیں، لیکن صبوحؔی کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ان شعراء کی صدائیں بھی گونجنے لگتی ہیں۔ یہی صبوحؔی کی شاعری کی عظمت ہے۔ صبوحؔی کی شاعری میں تخیل اپنی بلندیوں کو چھوتا دکھائی دیتا ہے۔

سیّد ہدایت علی صبوحؔی دہلوی بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے انکار کرنا نہ صرف ادبی بددیانتی قرار پائے گی بلکہ یہ ایک طرح سے کتمانِ حق بھی ہوگا۔ جس طرح وہ ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے اسی طرح شاعری بھی انفرادیت کی حامل ہے۔ یہ اَمر حیران کن ہے کہ صبوحؔی صاحب نے خود کو معروف کرنے کی نہ صرف کوشش نہیں کی بلکہ ایسے کلام کو جس کا شائع ہونا کسی بھی ادبی رسالے کے لیے اعزاز کی بات ہوتی، کبھی چھپنے کے لیے نہیں بھیجا بلکہ وہ ایک طرح کی گوشہ نشینی اور شہرت و ناموری سے ازخود کنارہ کشی کرنے کی شعوری کوشش کرتے رہے۔ اُن کو زیادہ لوگ نہیں جانتے اس کی دو وجوہات ہیں پہلی یہ کہ ان کا ایک بھی مجموعۂ کلام نہیں چھپ سکا۔ اگر ان کا مجموعۂ کلام چھپ جاتا تو یقیناً آج کی ادبی محفلوں میں ان کا ذکر ضرور ہوتا۔ اگر خطۂ ملتان میں چند بڑے شعراء کا تذکرہ کیا جائے تو صبوحؔی دہلوی بھی یقیناً ان میں شمار ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ چند لوگوں کے سوا ان کے ہمعصروں میں کوئی زندہ نہیں ہے۔ آپ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پیدا ہوئے اور اُسی کی دہائی کے شروع میں فوت ہو گئے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے کتنے لوگ موجود ہوں گے۔ یہ تو دو بڑی وجوہات تھیں جس کی وجہ سے آپ کو اتنی شہرت نہ مل سکی جس کے آپ حقدار تھے۔ لیکن پھر بھی مختلف کتب میں آپ کا ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ملتان کے شعراء میں آپ کا بھی ذکر کیا ہے:

> ''ہدایت علی صبوحؔی پاکستان بننے کے بعد ملتان آ گئے۔ دہلی میں قیام کے دوران سائلؔ دہلوی اور تاباںؔ سے اصلاح لیتے رہے۔[۱۳]

اسی طرح نعتیہ حوالے سے عارف معین بلے نے اپنے مضمون ''ملتان کے شعراء اور ان کے نعتیہ مجموعے'' اور اسد فیض کی مرتبہ کتاب ''ملتان کا عصری ادب'' میں آپ کا ذکر موجود ہے، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان سے آپ کی عظمت کا حق ادا نہیں ہوتا کیونکہ آپ واقعی خطۂ ملتان کے ایک بڑے شاعر ہیں جو زمانے کی نذر ہو گئے۔ آپ آخری ایام میں اپنا کلام ''جامِ صبوحؔی'' کے نام سے چھپوانا چاہتے تھے لیکن زندگی نے مہلت نہ دی اور آپ کا کلام جوں کا توں پڑا رہ گیا۔ ہماری دنیا کی یہ ریت رہی ہے کہ یاد اُنہی کو رکھا جاتا ہے جو اپنی ذات کو خودنمائی کے لیے پیش کرتے ہیں۔ صبوحی دہلوی اپنی ذات میں عظیم ضرور تھے لیکن اپنی خودنمائی یا شہرت حاصل کرنے کا شوق نہیں تھا ورنہ جس کا کلام ایسا ہو اسے کیوں نہ یاد رکھا جائے۔

ہے تشنگیٔ ذوق کی تسکیں میرے شعر
بیداد کا شکوہ نہ ہمیں داد کی حسرت

اک غنچہ مسلتے ہوئے فرمایا ہنس کر
لو دیکھ لو اپنے دلِ برباد کی حسرت

ان اشعار میں شاعر اپنی پیاس بھی بجھا رہا ہے کہ داد نہیں چاہیے بلکہ وہ تو اپنے ذوق کو تسکین پہنچا رہا ہے اور اپنے محبوب کی لاپرواہی کی خوبصورت ادا کا ذکر بھی ہے گو کہ صبوحی دہلوی روایتی شاعر ہیں کہ گوشت پوشت کے محبوب کا ذکر بھی کرتے ہیں اس کی اداؤں اور نازنخروں کی بات بھی کرتے ہیں اور اس کی ہر طرح کی اداؤں کو پسند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔شعر ہیں:

دل کی حالت یہ ہوئی جاتی ہے
بات بھی اب نہیں کی جاتی ہے
جن سے ہوتا ہے تعلق دل کا
ان کی ہر بات سہی جاتی ہے

میرے خیال سے اس طرح کی چند غزلیں ہی کیوں نہ ہوں کسی بھی شاعر کی بڑائی کے لیے کافی ہو سکتی ہیں لیکن صبوحی کے ہاں ایسی بے شمار غزلیں مل جاتی ہیں۔شعر دیکھئے:

حیاتِ غم نشاطِ قلب و جاں ہے
مگر یہ زندگی ملتی کہاں ہے
جوانی کا وہ دورِ عاشقانہ
ذرا آواز دینا تو کہاں ہے

آپ کی شاعری زندگی کے تمام موضوعات کا اضافہ کرتی ہے یا یوں کہیے کہ آپ نے اپنی شاعری میں ہر طرح کا موضوع اپنایا ہے۔کسی بھی ادیب کی خصوصیت ہوتی ہے خواہ وہ شاعر ہو یا نثر نگار وہ اپنے ماضی اور حال کے تجربات و مشاہدات کو اپنے ادب پارے میں ضرور سموتا ہے اور اپنے مستقبل کے بارے میں بھی متفکر ہوتا ہے۔یہی کسی تخلیق کار کی حساسیت ہوتی ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہوتی ہے۔آپ کی شاعری میں بھی زندگی سے وابستہ تمام موضوعات پائے جاتے ہیں۔دکھ، درد، زندگی کے مصائب، معاملاتِ حسن و عشق، غرض ہر طرح کے اشعار آپ کے کلام میں موجود ہیں۔آپ کی شاعری میں انسان کے لیے تحرک موجود ہے اور آپ انسان کی فطرت کو سمجھتے ہوئے اپنی شاعری میں کس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔شعر دیکھئے:

جہاں تک تیرے جلوؤں کی فروانی نہیں جاتی
نگاہِ شوق کی آئینہ سامانی نہیں جاتی
صنم خانے میں تجھ کو ڈھونڈنے آیا ہوں کعبے سے
مسلمان ہو کے خوئے نا مسلمانی نہیں جاتی

صبوحی کس قدر عمدہ انداز میں انسانی فطرت کی عکاسی کرتے ہیں اسی کے ساتھ ہی پھر زندگی کی بے ثباتی کا ذکر بھی خوبصورت پیرائے میں بیان کر جاتے ہیں۔شعر ہے:

عطا ہو خار کو وہ عمرِ باقی اور پھولوں کو
ملے یہ زندگی جو زندگی مانی نہیں جاتی

انسان، زندگی اور کائنات کی بے ثباتی کا ذکر جس انداز میں اِس شعر میں کیا گیا ہے اس سے عمدہ مثال کیا ہوسکتی ہے؟ انسانی زندگی بھی پھول کی مانند ہے کہ انسان ہزاروں خواہشات لے کر آتا ہے اور ہزاروں خواہشات اس کی زندگی کے ساتھ دفن ہو جاتی ہیں اس سے ایک یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ انسان کی زندگی پھول کی طرح ہے کہ دنیا میں خوشبو بکھیری اور چلا گیا کسی بھی شاعر کی یہ بڑی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کے اشعار بار بار پڑھنے سے نئے سے نئے معنی سامنے آئیں۔ صبوحی دہلوی کی یہ بھی ایک خوبی ہے کہ وہ اساطیری موضوعات نہیں چنتے بلکہ زندگی کے سلگتے مسائل سے وابستہ موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ شعر دیکھئے:

ہنسے جو پھول تو شبنم نے رو کے اُن سے کہا
یہاں سے رات ابھی اشکبار گزری ہے

شراب کے موضوع پر آپ کے ہاں بہت زیادہ اشعار مل جاتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شراب یا مئے کا لفظ ان کے ہاں استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے مثلاً شعر دیکھئے:

اِک بطِ مے بھی نہیں ہے کیا صبوحی کے لیے
فصلِ گل میں کچھ تو پاس ابر و باراں کیجئے

دوسرا شعر ہے:

صبوحی ہاتھ سے ساقی کے چھین کے پی لے
تو دورِ جام کے آنے کا انتظار نہ کر

اور شعر دیکھئے:

ساغر میں صبوحی کے تو میخانہ اُلٹ دے
ساقی کہیں چھینٹوں سے بھلا پیاس بجھی ہے

لیکن آپ کے اس شعر سے یقین ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں شراب کا لفظ واقعی استعارۃً استعمال ہوا ہے کہ

میں شراب پی رہا ہوں تو صبوحی اس یقین پر
کہ گناہ گار ہوتا جو نہ بادہ خوار ہوتا

بہرحال شراب یا مے کے موضوع پر آپ نے بہت خوبصورت شعر کہے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں اسی طرح آپ کے ہاں ایک طرف خدا سے گلے کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے مثلاً

الٰہی تیری دنیا میں نہ مرتے ہم تو کیا کرتے
تیرے وعدوں کی بھی روزِ جزا تک بات جا پہنچی

دوسری طرف دنیا سے بغاوت کی صورت موجود ہے اور بغاوت بھی شدت کی موجود ہے۔ شعر دیکھئے:

حالاتِ زمانہ سے اگر بن نہیں سکتی
ماحول کو تم آگ لگا کیوں نہیں دیتے

اسے باغیانہ کہیں یا انقلابی فکر، ایسی شاعری آپ کے ہاں کافی مقدار میں موجود ہے جس میں اپنے ہم خیال اور ہم وطنوں کو انقلاب کے لیے تیار کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی شاعری میں صوفی، ملا، زمیندار، جاگیردار، سرمایہ دار پر گہرا طنز موجود ہے آپ سے غریب کی حالتِ زار دیکھی نہیں جاتی کیونکہ آپ خدا ترس انسان تھے اس لیے اس پر کڑھتے کہ غریب کا استحصال نہیں ہونا چاہیے اس کو بڑی خوبصورتی سے لکھتے ہیں:

یہ صوفی و ملا یہ زمیندار یہ حاجی
ان میں ہر اِک اپنے تخیل کا خدا ہے

دوسرے شعر ہیں:

میں فرشتہ نہیں مگر واعظ
یوں تری طرح عیب جو تو نہیں
میرے ساغر میں رس نہیں مے ہے
آدمی کا مگر لہو تو نہیں

آپ کے ہاں آمریت بھی موضوع بنی ہے کہ آپ آمریت کے خلاف تھے اور جمہوریت کے قائل تھے۔ جو ملکی صورت حال تھی وہ بھی صبوحؔی کے سامنے تھی۔ مارشل لاء لگتے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے یہ سب حالات ایک شاعر سے جو معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے، کیسے برداشت ہوسکتی تھیں؟ لکھتے ہیں:

جو آمروں کے اشاروں پہ رقص کر نہ سکے
وہ سر پھرے ہی سرِ تختہ ہائے دار رہے
چمن کو اس کے نگہبان ہی لوٹ لیں مل کر
تو پھر بہار کے چہرے پہ کیا نکھار رہے
کسی کے کتّوں کی قسمت ہوں نعمتیں ساری
کسی کو نان جویں کا بھی انتظار رہے

صبوحؔی کا مزاج اور فکر کسی بھی ناانصافی کو برداشت نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں یا قلم سے جہاد کرتے ہیں اور دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں یہی انسانیت ہے۔ یہی انسان دوستی ہے جو صبوحؔی کی شاعری میں بھری ہوئی ہے۔

صبوحؔی کی شاعری میں ایک موضوع وطن سے بے لوث محبت کا بھی ہے کیونکہ تحریک پاکستان میں خود شامل رہے اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن حاصل کرنے کی جدوجہد میں عملی حصہ لیا، اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اور پاکستان بنتے دیکھا اور ہجرت بھی کی لیکن پاکستان بننے کے بعد جو حال اس کا ہوا وہ آپ سے برداشت نہیں ہوا تو آپ لکھتے ہیں:

ناموسِ وطن کے ہوں کہ ہوں نام کے سودے
بازاروں میں ہو رہے ہیں اجسام کے سودے
اصنام کے سودے مئے گلفام کے سودے
فخرِ امم لوط و بنی عاد ہیں ہم لوگ
اے دوست یہ کیا کم ہے کہ آزاد ہیں ہم لوگ

اس طرح کے بہت سے اشعار آپ کی شاعری میں موجود ہیں جن میں آپ دُکھ کا اظہار بھی کرتے ہیں اور طنز بھی کرتے ہیں کہ جو آزادی ہم نے حاصل کی جو ملک ہم نے حاصل کیا وہاں اب تمام جرائم وجود میں آ چکے ہیں جو اس ملک کے لیے ناسور بن چکے ہیں یہ دکھ ان کی شاعری میں موجود ہے۔

صبوحؔی کی شاعری کے فنی محاسن کا جائزہ لیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ نے صنائع و بدائع کا عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ جس سے آپ کی شاعری نہ صرف جمالیاتی سطح پر بلکہ معنوی طور پر بھی بلند مرتبے پر فائز دکھائی دیتی ہے۔ تشبیہ، استعارے، تلمیحات کے علاوہ دیگر صنائع آپ کی شاعری میں جہاں کہیں آئے ہیں وہاں اشعار کی معنوی تہ داری میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی۔ تشبیہ کا شعر دیکھئے:

شبنم نے بھر دیئے ہیں کٹورے گلاب کے
اب میکشان مست اِدھر بھی گزر کریں

استعارہ بھی بہت خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ شعر دیکھئے:

کوئی انگڑائی لے کے مسکرایا
مری آنکھوں سے ڈھلکے دو ستارے

تلمیح کے اشعار ہیں:

اک جھلک دیکھ کے موسیٰ تو سنبھل بھی نہ سکے
دیکھنے والے نے اللہ میاں تک دیکھا
تم سے پہلے کئی شدّاد یہاں ہو گزرے
ان کی جنت کا یہاں تم نے نشاں تک دیکھا

ترکیب سازی شاعر کی تخلیقی اُپج کا عمدہ اظہار اور شعری فن کا کمال ہوتا ہے۔ صبوحؔی دہلوی نے شعری حسن سے بھرپور تراکیب اختراع کی ہیں اور اپنے اشعار میں نہایت خوبی سے استعمال کیے ہیں۔ مثلاً ''شکر فشاں'' کی ترکیب ہے جو کہ پہلے پڑھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نئی تراکیب بنانا اور انہیں استعمال کرنے کا فن آپ جانتے ہیں۔

صبوحؔی دہلوی کے کلام میں غزل کے ساتھ نظمیں بھی شامل ہیں جو زندگی کے گوناں گوں تجربات کا اظہار ہیں۔ مثلاً ہمارے غدار لیڈر، انقلاب اکتوبر، یہ قوم، میرے دیس میں، شہید قوم مرحبا تیرا بڑا نصیب ہے، مجاہد عظیم اُٹھ، کشمیر جل رہا ہے، جہاد سن ستاون کے غازی وغیرہ اس کے ساتھ چند سیاسی لیڈروں پر بھی نظمیں موجود ہیں جن کے ساتھ آپ کے مراسم بھی تھے جن میں قائداعظم، لیاقت علی خان وغیرہ یہ آپ

کے شاعری کے نمایاں موضوعات تھے۔آپ نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر شاعری کی ہے آپ نے اپنی شاعری میں اپنی عظمت کا اظہار کیا ہے اور کیوں نہ کرتے کہ شاعرانہ تعلیٰ غزل گو شاعر کا ہنر بھی ہوتی ہے اور حق بھی۔

جو اب ایسی غزل کا کس سے بن آئے بھلا ساقی
تری آنکھوں کے پیمانوں میں ڈھل کر جو غزل آئے

صبوحی دہلوی واقعی بڑے شاعر تھے زمانے نے انہیں گم نام بنایا ورنہ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔انہیں کا شعر ہے:

صبوحی کی غزل اچھی سہی لیکن حقیقت میں
گل و بلبل کی رنگیں داستاں معلوم ہوتی ہے

ہدایت علی صبوحی کے کلام میں نعت بھی خاصی تعداد میں موجود ہے۔نعت لکھنا آپ اپنے لیے باعث رحمت سمجھتے ہیں۔نعت ایسی صنف سخن ہے جس میں تمام اُردو شعراء نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنے لیے رحمت سمجھا ہے۔حضور اکرمؐ کی بارگاہ میں عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔صبوحی بھی انہیں میں شامل ہیں کہ جنہوں نے اپنی عقیدت کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

ملتا تو میں لاتا پرِ جبریل صبوحی
نعت نبی میں کیا لکھوں شکستہ قلم سے

آپ کی نعتیہ شاعری کے بارے میں طارق محمود لکھتے ہیں:

''نعت لکھنا ان کے دل و جاں میں رچی بسی ہے۔ان کی شاعری کا غالب حوالہ بھی
نعتیہ کلام ہی ہے لیکن انہوں نے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔''[۱۴]

صبوحی دہلوی کی شاعری میں غزل اور نعت ہی بڑا حوالہ ہے۔آپ ہجرت کر کے ملتان آنے کے بعد نعتیہ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔آپ کی نعتیہ شاعری فن کا اظہار بھی ہے اور نبی کریمؐ سے سچا لگاؤ بھی ہے۔اپنی محبت کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

کعبہ دکھائی دے نہ کلیسا دکھائی دے
دیکھوں جدھر حضورؐ کا روضہ دکھائی دے
نبیوں میں یوں حضورؐ کا مکھڑا دکھائی دے
تاروں میں جیسے چاند چمکتا دکھائی دے

صبوحی، سرتاپا عشقِ مصطفیٰؐ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔آپؐ کی ذاتِ اقدس اِن کے لیے کل کائنات ہے۔ہر چیز سے بالا ذکر مصطفیٰؐ ہے۔حضورؐ کی تعریف دل و جان سے کی ہے۔شعر ہیں:

ہائے وہ ایک ادا حسنِ ادا سے پہلے
بن کے آئی جو قضا میری قضا سے پہلے
روح کے ساز میں اعجاز نوا سے پہلے
کوئی نغمہ ہی نہ تھا صلِ علیٰ سے پہلے

کہیں کہیں تو آپ کے لیے ذکرِ مصطفیٰؐ ذکرِ حرم سے بھی بڑھا ہوا ہے۔شعر ہے:

انوارِ مصطفیٰ کے خزینے کی بات کر
ذکرِ حرم سے پہلے مدینے کی بات کر

حضور اکرمؐ کی تعریف کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔آپ نے ہر پہلو سے اور ہر رنگ سے حضورؐ کی تعریف کی ہے۔

محمدؐ نورِ یزداں ہے محمدؐ شمع عرفاں ہے
محمدؐ ہی کے جلووں سے منورِ حرم امکاں ہے

نعت اُردو شاعری میں ایسا موضوع ہے جس کو شاعر بلا اختیار اپناتے ہیں۔حقیقت بھی یہی ہے کہ نعت کے بغیر اُردو شاعری نامکمل ہے۔کوئی بھی مسلمان شاعر ایسا نہیں ہے جس نے نعت نہ کہی ہو بلکہ ہندو شعراء نے بھی آپؐ سے عقیدت کا اظہار کیا ہے تو صبوحیؔ بھی لکھتے ہیں:

جو آپ کا حبیب خدا کا حبیب ہے
جو آپ کے قریب خدا کے قریب ہے
جبریل اب بھی دیتا ہے اس در پہ حاضری
دربارِ مصطفیٰ کا وہ اب بھی نقیب ہے

صبوحیؔ دہلوی کا ہی ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے:

کملی والے نے مری لاج صبوحیؔ رکھ لی
سامنا تھا سرِ محشر بڑی رسوائی کا

صبوحیؔ دہلوی اُردو شاعری کا وہ گم گشتہ اور نایاب گوہر ہیں جن کی زمانے نے قدر نہ کی۔اُن کے کلام کے شعری محاسن پر نگاہ ڈالی جائے تو وہ ملتان کی اُردو شعری روایت میں ایک بلند تر مقام پر فائز ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے غزل کی شعری روایت کو کامیابی سے اپنایا بلکہ اِس میں قابلِ قدر اضافہ بھی کیا۔اُن کا کلام ایک عرصے تک گوشۂ گمنامی میں رہا لیکن جیسے گوہرِ آبدار پانی کی گہرائیوں میں رہ کر بھی اپنی پہچان ایک نہ ایک دِن کرا ہی دیتا ہے ویسے ہی صبوحیؔ دہلوی کے کلام کے شعری محاسن اُنہیں ملتان کی شعر و ادب کی روایت میں ایک قابلِ قدر مقام عطا کرتی ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ جیسے جوہری، گہر ہائے آبدار تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے ویسے ہی ناقد اور محقق گم شدہ شعری خزانے کی جستجو کرتا ہے۔ہم نے اِس دُرِ نایاب-صبوحیؔ دہلوی کے کلام کو پردۂ گمنامی سے نکال کر ادب و فن کے پارکھوں اور جوہر شناسوں کے روبرو رکھنے کا کام کیا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر: ''ملتان میں اُردو شاعری''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۹۴۔

۲۔ آنس معین بلے، سیّد: ''روزنامہ نوائے وقت''، ملتان، ۲۸ ستمبر ۱۹۸۱ء۔
۳۔ سکندر عقیل رحمانی: ''روزنامہ آفتاب''، ملتان، ۷ اکتوبر ۱۹۸۱ء۔
۴۔ انٹرویو: محمد علی ڈاکٹر، بمقام: نشتر میڈیکل کالونی، کوٹھی نمبر ۲۳، ملتان، بروز اتوار، بوقت سہ پہر ۳ بجے، ۱۲ دسمبر ۲۰۱۰ء۔
۵۔ انٹرویو: عاصی کرنالی ڈاکٹر، بمقام: شالیمار کالونی، ملتان، بروز بدھ، بوقت شام ۵ بجے، ۱۵ دسمبر ۲۰۱۰ء۔
۶۔ انٹرویو: شوذب کاظمی ڈاکٹر، بمقام: ولایت حسین کالج، ملتان، بروز منگل، بوقت صبح ۱۰ بجے، ۲۱ دسمبر ۲۰۱۰ء۔
۷۔ انٹرویو: محمد امین ڈاکٹر، بمقام: شعبۂ فلسفہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، بروز بدھ، بوقت دوپہر ۲ بجے، ۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء۔
۸۔ انٹرویو: صدیق قادری ڈاکٹر، بمقام: کمیونٹی سنٹر، نشتر میڈیکل کالج، ملتان، بروز منگل، بوقت صبح ۱۰ بجے، ۲۸ دسمبر ۲۰۱۰ء۔
۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: ''نظمِ جدید کی کروٹیں''، سنگت پبلشرز، لاہور، بار چہارم، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱-۲۲۔
۱۰۔ عابد علی عابد، سیّد: ''تنقیدی مضامین''، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۰۔
۱۱۔ ایضاً ص ۲۱۱۔
۱۲۔ معصوم رضا: ''اُردو شاعری کے خدوخال عالمی ادب کے تناظر میں''، پرنٹ ایکس، ناظم آباد، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۱۔
۱۳۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر: ''ملتان میں اُردو شاعری''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۹۴۔
۱۴۔ طارق محمود: ''ہدایت علی صبوحی دہلوی کی نعتیہ شاعری'' مشمولہ: ''الزبیر''، مدیر شاہد حسن رضوی، ڈاکٹر، اُردو اکیڈمی، بہاولپور، شمارہ ۲، ۲۰۱۰ء۔